ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی

جمال الدین اصفہانی کے کلام میں ہجو و مزاح کا عنصر

محمد جمال الدین بن عبدالرزاق اصفہان میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ اصفہان ہی میں گزرا۔ حصولِ معاش کے لیے اسے آذربائیجان اور مازندران کا بھی سفر کرنا پڑا۔ علم و حکمت اور ریاضی میں دسترس کے علاوہ اس نے نقاشی اور زرگری میں بھی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ اسی بنا پر اپنے زمانے میں جمالِ زرگر و نقاش کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی۔ اس کے چار بیٹوں میں سے صرف ایک بیٹے کمال الدین اسمٰعیل نے شاعری میں نام پیدا کر کے خلف الصدق ہونے کا ثبوت دیا۔ جمال نے ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں وفات پائی۔

جمال الدین نے اصفہان کے مختلف رؤسا، رجالِ بزرگ اور سلاطین، امرا اور صدور کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کے ممدوحین کی تعداد ۲۷ تک پہنچتی ہے۔ اپنے دور کے بعض مشہور شعرا، مثلاً خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی اور رشید وطواط سے اس کے روابط تھے۔

جس طرح اس نے شاعری کی مختلف انواع ـــــ قصیدہ، غزل، قطعہ، ترکیب بند، رباعی وغیرہ ـــــ میں طبع آزمائی کر کے اپنی مہارت و استادی کا لوہا منوایا ہے، اسی طرح موضوعات و مطالب ـــــ مدح و ہجو، اور وعظ و حکمت ـــــ کے معاملے میں بھی اسے ماہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

فارسی کے دیگر شعرا کے مقابلے میں جمال کے ہجویہ اشعار میں عریانی، رکاکت اور ابتذال کسی حد تک کم ہے، وہ سیدھے سادے اور پُرتاثیر انداز میں، ہجو اور طنز کے مضمون کو اٹھاتا اور آگے بڑھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ایسے اشعار میں غیر مانوس الفاظ، دشوار ترکیبات اور دور از کار تشبیہات و استعارات شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ اور یہ امر اس بات کی علامت ہے کہ اس کے یہ اشعار اس کے ذوق و طبع بلند اور احساسات کی پیداوار ہیں اور شاعر نے اس ضمن میں ہر قسم کے تکلف، تصنع اور بھاری بھرکم علمی اصطلاحات کے استعمال سے پہلوتہی کی ہے، جبکہ اس دور کے بعض شعرا کے یہاں یہ باتیں عام دیکھنے میں آتی ہیں۔

یوں تو جمال کے یہاں مختلف شعرا اور اشخاص کی ہجو میں اشعار ملتے ہیں، لیکن زیادہ تر خسیس امرا اور بخیل شرفا اس کے ان حملوں کا نشانہ بنے ہیں۔ اپنی جائے ولادت کو بھی اس نے کسی بنا پر برا بھلا کہا ہے۔ اس کی ہجوگوئی کے کئی اسباب ہیں، جن کا اپنے اپنے مقام پر ذکر ہوگا، تاہم ایک سبب، جسے بنیادی سبب سمجھنا چاہیے، خود اس کے نزدیک یہ ہے کہ جو میرا حق ضائع کرتا ہے اس کی ہجو کہنا عین جائز ہے اور اس وجہ سے مجھے معذور و مجبور جاننا چاہیے:

اگر در شعر من زین پس یکی بیت ہجا گفتم — مرا معذور باید داشت چو آن بیت می خوانی
روا باشد ہجای آن کہ حق من کند ضایع — بخوان "ان لا یحب اللہ" اگر قرآن ہمی دانی

ایک اور قطعے میں، جسے علامہ شبلی نے انوری سے منسوب کیا ہے، جمال نے ہجوگوئی کا سبب یہ بتایا ہے کہ حریص شعرا کے یہاں تین طریقے رائج ہیں۔ پہلے مدح کہتے ہیں، جب ممدوح سے کچھ ہاتھ نہیں لگتا تو تقاضے کے طور پر ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا جاتا ہے، اور جب اس صورت میں بھی بات نہ بنے تو حصولِ مال کے لیے ہجو کا ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ تفصیل دے کر اپنے ممدوح سے کہتا ہے، حضور اوّل الذکر دو باتیں ہو چکیں، اب تیسری کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ دوسرے لفظوں میں وہ کہتا ہے، نکالتا ہے مال یا کروں تیری رگڑائی:

بزرگوارا در انتظار بخشش تو — نماندہ است مرا طاقت شکیبائی ...
سہ چیز رسم بود شاعران طامع را — نخست مدح و دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر، اگر نداد ہجا — من آن دو گانہ بگفتم، سوم چہ فرمائی؟

درج ذیل دو اشعار میں اس نے مدح اور ہجوگوئی میں اپنی شاعرانہ قوت و استعداد کا بلند بانگ دعویٰ اور خود کو کچھ اس قدر خوفناک ظاہر کیا ہے کہ شاید ہی کوئی ممدوح اسے ایسا جان کہ بھی خست و بخیلی سے کام لے سکے۔ ہجوگوئی میں وہ آسمانِ مردم خوار اور اس کا قلم سانپ کی طرح زہر فشاں ہے:

من گہِ مدح آفتابِ نور فشانم — من گہِ ہجو آسمانِ مردم خوارم
شہد چشاند بمدح لفظِ چو نوشم — زہر فشاند ہجو کلکِ چو مارم

اس دعوے کے علاوہ وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ تمام تر انعام و اکرام کے باوصف اگر میں نے کسی کی ہجو نہیں کہی تو یہ میرا اس پر احسان ہے:

راستی با این تفضلہا و این انعامہا ہر کرا ہجوی نگفتم بروی از من منتی است

مندرجہ بالا اشعار سے بظاہر یہ پتا چلتا ہے کہ جمال طبعاً ایک ہجو گو شاعر ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور مختلف قرائن کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فطرتاً ہجو و ہزل کا شاعر نہیں ہے۔ ممکن ہے ان گوناگوں اسباب و علل کے علاوہ، جنھوں نے اسے اس ناشائستہ کام پر مجبور کیا اس نے بھی اپنے بیٹے کمال الدین اسمٰعیل کی طرح ہجو گوئی کو شاعری کے لوازم میں سے جانا ہو۔ بہرحال آخر میں اس نے اُسے بُری بات سمجھتے ہوئے اس سے توبہ کر لی تھی، جس کا اظہار اس کے اس قطعے سے ہوتا ہے۔ اس میں وہ ہجو اور سابقہ کی ہوئی مدح دونوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے :

مرا خود نیست عادت ہجو گفتن کہ کردستم طمع زین قوم کوتاہ

معاذاللہ کہ کس را ہجو گویم زمدحِ گفتہ نیز استغفر اللہ

اگر ہم تاریخِ ادب کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اربابِ فضل و دانش خوار و زبوں رہے ہیں جبکہ کاسہ لیسوں، بے غیرتوں اور گھٹیا اور پست فطرت لوگوں کی زندگی بڑی خوش حالی میں بسر ہوئی ہے اور وہ اوجِ کمال پر بھی پہنچے ہیں۔ ظاہر ہے شاعر کسی معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے، یعنی نازک دل، لطیف احساسات اور تند و تیز و سوزاں جذبات اس کا سرمایۂ حیات ہیں۔ جب وہ معاشرے میں کسی قسم کی ناہمواری، غلط بخشی، غلط کاری اور اس قسم کی خرابیاں دیکھتا ہے تو اس کا دل کڑھتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ دل میں آئی ہر بات کہہ کر اپنی ذہنی کوفت کو کم کر لیتا ہے۔ جمال کا قطعہ "مقتدایانِ شہر" ایسے ہی دلی رنج اور کوفت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس قطعے میں شاعر نے ان امرا و ورزا کو ہجو و طنز کا نشانہ بنایا ہے جن کا تعلق تو معمولی گھرانوں سے ہے اور جو علم و فضل سے بے بہرہ ہیں، لیکن فضل و دانش کی لاف مارتے تھکتے نہیں، وہ انھیں کفش دزد، فریب کار اور دھوکا باز کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان خود ستا خواجگان کا نہ تو ظاہر اچھا ہے اور نہ باطن ہی کسی خوبی سے آراستہ ہے۔ یہ رذیل لوگ ہیں۔ ان کی مدح و ستائش سے اجتناب بہتر ہے کہ وہ اس لائق ہی نہیں ہیں۔ ان کے اعمال و افعال چارپایوں کی حرکات سے ملتے جلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شاعر ان بے وقعت و کم مایہ "حضرات" کو تکبر و نخوت کے باعث جن کا سر آسمان سے چھو رہا ہے لیکن جو حقیقت میں بھک منگے ہیں، بُری طرح آڑے ہاتھوں لیتا ہے،

ہر چند ان سے اس کی شناسائی ہی کیوں نہ ہو۔

چھوٹی بحر کے اس قطعے میں ایک خاص نغمگی اور طنطنہ ہے، پھر چھوٹی چھوٹی دلچسپ و دلکش تراکیب، پُرطمطراق قوافی، روانی کلام اور پُرتاثیر صنائع لفظی نے اس پورے قطعے کو ادبی اور فنی دونوں لحاظ سے ایک شاہ کار ہجو بنا دیا ہے:

خواجگان را نگر برای خدا　　　کاندرین شہر مقتدایانند
ہمہ عامی و آن کہ از پی فضل　　　لاف پیما و ژاژ خایانند
ہر یکی در ولایت و دہ خویش　　　کفش دزد و کلہ ربایانند
خشک مغزان ولیک تر دامن　　　تیرہ رویان و خیرہ رایانند
چہ ستایش کنم گروہی را　　　کہ ہمہ خویشتن ستایانند
بسکہ شان چار پای کردستند　　　لاجرم جملہ چار پایانند
ہمہ چون ارہ تیز دندانند　　　ہمہ چون تیشہ سرگرایانند
لقمہ نزد جملہ فاضل تر　　　زانکہ در شرع رہنمایانند
ہمہ از ہیچ کمترند، ارچہ　　　از تکبر ہمہ خدایانند
من ازینان چہ طرف بربندم　　　کہ ہمہ ہمچو من گدایانند
تیز در ریششان بخرواران　　　ورچہ ام جملہ آشنایانند

اسی طرح ایک قصیدے "در شکایت از روزگار" میں ایک جگہ ان پست فطرت امرا کے لتے لیے گئے ہیں۔ شاعر کے مطابق ان لوگوں کی نحوست و بدبختی نے زندگی کے تمام شعبوں کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب سے یہ متکبر برسر اقتدار آئے ہیں، پانی بھی سراب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ احترام، عزت اور بزرگی کا جنازہ نکل چکا ہے۔ خست و بخل کا کچھ اس قدر دور دورہ ہے کہ آواز بھی جواب دینے میں خاموش ہے۔ سورج نے بھی گویا ان بخیلوں کی طبع اپنا لی ہے جو بادلوں میں جا چھپا ہے۔ ان کا سر مغز سے تو عاری ہے لیکن کبر کی باد نے اسے اس طرح کر دیا ہے جیسے وہ خیمہ حباب ہو...

شاعر اسی انداز میں اس گروہ کے بُرے اثرات گنوا کر قصیدے کے آخر میں اپنے قاری کو فضل و

دانش کے حصول سے منع کرتا ہے۔ اس لیے کہ بقول اس کے اس دور میں علم و فضل کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ آج وہی صاحبِ اختیار و اقتدار اور اہلِ عز و وقار ہے جس کے یہاں مال و دولت کی ریل پیل ہے، بے شک اس مال و دولت کا وسیلہ ناجائز اور غیر مباح ہو۔ اس قصیدے کے بعض اشعار حسن تعلیل کا دلچسپ نمونہ ہیں :

آہ ازین خواجگان دون ہمت — کآب از ادبار شان سراب شدست
تا شدستند کدخدای جہان — خانۂ مکرمت خراب شدست
بخل از ایشان جہان چنان آموخت — کہ صدا خامشِ جواب شدست
طبع ایشان گرفت ہم خورشید — لاجرم زابر در حجاب شدست
سر بمغز شان نگر کز باد — راست چون خیمۂ حباب شدست
لعل از بارِ منّت خورشید — در دل سنگ خون ناب شدست
گوہر از لافِ رعد و طعنۂ ابر — در دہانِ صدف لعاب شدست
دست اندر عنانِ فضل مزن — کہ کرم پای در رکاب شدست
فضل بگزار کآنکہ زر دارد — در جہان مالک الرقاب شدست

ایک اور قصیدے "در شکایت روزگار" میں جمال نے اپنی عقل و دانش اور فضیلت و شاعری کی ستائش کی ہے اور آخر میں ایسے ہی دوں فطرت خواجگان کو رگیدا ہے، لیکن ان سے پہلے اپنی ذات کو ہدفِ طنز و ہجو بنایا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس کے دور میں صحیح معنوں میں کوئی ممدوح نظر نہیں آرہا، اسی لیے وہ اپنی مدح کرنے پر مجبور ہے، یعنی مدح گوئی اس کی گھٹی میں پڑی ہے، صاحبِ بخشش و عطا ممدوح نہ ملے تو اپنی مدح ہی سہی۔ وہ خود کو ایک بے ہودہ گو اور بے حمیت انسان قرار دیتا ہے جسے حالات نے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ جس انداز میں شاعر نے اپنے اصفہانی ہونے کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت اہلِ اصفہان اقتصادی بدحالی کا شکار تھے :

چکنم چون نماند ممدوحی — مدح بر خویشتن ہمی خوانم
ورنہ معلوم ہر کست کہ من — مردکی ژاژخای و کشخانم

شکم از طعام خالی ماند — لاجرم ہمچو چنگ نالانم
ہمہ احوال خویشتن گفتم — چون بگفتم من از سپاہانم
اینچنین خواجگانِ دون ہمت — کہ ہمی نام گفت نتوانم
تا دل اندر مدیحشان بستم — بکفِ نیستی گروگانم

ہر چند جمال نے کنجوس امرا و رؤسا کو لتاڑا ہے لیکن ان کا نام کہیں بھی اس نے کھل کر نہیں لیا۔ مندرجہ بالا قطعے میں اس نے اتنا کہا ہے کہ میں خواجگان کا نام نہیں لے سکتا۔ بظاہر اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جمال نے مروت سے کام لے کر ان کے نام پردۂ اخفا میں رکھے ہیں۔ لیکن ہم عصر شعرا کے معاملے میں اس کے یہاں ایسی مروت نظر نہیں آتی۔ انھیں وہ نام لے لے کر کوستا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے بالواسطہ اور عام امرا کی ہجو کہہ کر اپنے ممدوحین کو ڈرایا یا شرم دلائی ہے اور اس میں وہ شاید کسی حد تک کامیاب رہا ہے۔ ورنہ ایک آدھ جگہ وہ ضرور کسی امیر کا نام لیتا۔ بہرحال صورت حال کچھ بھی ہو، شاعر اپنی تمام تر بدحالی کے باوصف یہاں ننگا نظر نہیں آتا۔

درج ذیل قطعے میں بھی یہی اشراف اس کے طنز و ہجو کا ہدف ہیں۔ ان کی انتہائی کنجوسی کو بظاہر سیدھے سادے انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن یہ سادہ الفاظ اپنے اندر بھرپور طنز لیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ممدوح کی اطاعت کو نماز کا درجہ دیتا ہے لیکن اس کے جواب میں اُسے مال و دولت اور انعام و اکرام سے محروم رہنا اور روزہ رکھنا پڑتا ہے۔ جو ممدوح خود "حرص" سے بھی بڑھ کر بھوکا ہو، اس سے صلے کی توقع عبث ہے۔ وہ ان آدم صورت لیکن سگ فطرت ممدوحین سے اجتناب کو بہتر قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق ان کا وعدہ اور ان کی گفتار دونوں حقیقت سے عاری ہیں۔ بخل کے باعث ان کا دروازہ کچھ اس طرح بند ہے کہ اس کے کھلنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

از نعمت آن بروزہ می باشم — کش طاعت چون نماز می بینم
از خوان کہی چہ چشم شاید داشت — کش گرسنہ ترز آز می بینم
زین سگ صفتان آدمی صورت — اولیٰ تر احتراز می بینم

مندرجہ ذیل دو قطعات میں، دو ایک سخت الفاظ کے سوا ہجو کا انداز اتنا ہلکا پھلکا اور

بے آزار ہے کہ شاید وہ شخص بھی، جس کی ہجو کہی گئی ہے، اس کا ملال نہ کرے۔ جمال نے ان دو قطعات میں کسی نامعلوم امیر کی کنجوسی کی عکاسی بڑے پیارے اور اچھوتے انداز میں کی ہے۔ پہلے قطعے میں اس نے اس امیر کو کتے سے کم تر قرار دے کر مسلمانوں کے لیے اس کا طعام جائز نہیں سمجھا، اس لیے کہ اس کے نزدیک اس امیر کا طعام ظلم و جور اور مالِ حرام سے تیار ہوا ہے۔ پھر خود لوگ بھی ایسی دعوت کو پسند نہیں کرتے، اور اگر کوئی اتفاق سے اس کے دروازے پر چلا بھی جائے تو دربان اور حاجب اسے اندر نہیں جانے دیتے۔ شاعر ایسے شخص کی دعوت کو پسندیدہ نہیں سمجھتا جو مہمان کے ہر ہر لقمے پر نظر رکھے۔ وہ اس کے دسترخوان کو منحوس جانتا ہے۔ آخر میں وہ صنعتِ مراعاۃ النظیر سے کام لے کر اس امیر کی انتہائی باریک روٹی کو، کہ خود اس سے گرسنگی ٹپک رہی ہے، ہلالِ رمضان سے تشبیہ دیتا ہے:

خوان می فگند کنون مسلمانان — آن خواجہ کہ سگ بر او شرف آرد
خوانی کہ ز خون آدمی باشد — افطار بدان کسی روا دارد؟
خود کس نرود، و گر رود آنجا — دربانش و پردہ دار نگزارد
خوانی چہ کنی کہ میزبان او را — ہر لقمہ ہزار بار بشمارد
آن سفرۂ نحس مرد ریگش بین — کش پیش شدن کسی نمی یارد
و آن قرص حقیر چون ہلال صوم — کش گرسنگی ز لب ہمی بارد

دوسرا قطعہ صنائع لفظی اور ہلکے پھلکے طنز کا بہترین مظہر ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر، رواں بحر اور حرف "ن" کی پیہم تکرار نے ایک خاص نغمگی پیدا کر دی ہے اور یوں قاری طنز اور نغمگی و موسیقی دونو سے لطف اندوز ہو کر تھوڑی دیر کے لیے اس قطعے میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ شاعر نصیحت کرتا ہے کہ ایسے رئیس کے دسترخوان سے بہرہ اندوز نہ ہونا چاہیے جو مال کو اپنی جان سے عزیز تر جانتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی بیوہ یا بچے کا مال کھانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ایسے خسیس کی دعوت قبول کی جائے۔ وہ اس کے دسترخوان کو خون کی طرح حرام کہہ کر اس کے گرد پھٹکنے سے بھی منع کرتا ہے۔ پھر وہ مختلف دلائل و توجیہات پیش کر کے اپنی اس بات پر اصرار کرتا ہے:

خواہی کہ نزد خواجہ قبولی بود ترا — منشین بخوان او، برو از نان او مخور

ورچند گویدت بتکلف کہ نان بخور — فرمان بر آنچہ گفت و بفرمان او مخور
زنہار خور و لیک مخور نانش زینہار — وز نان طفل و بیوہ بخور زان او مخور
خوانش چو خون حرام بود گرد آن مگرد — نانش چو جان عزیز ست از جان او مخور
از گوشتش ہمی چش و از نان او مچش — از خون او ہمی خور و از خوان او مخور

ذیل کے تین قطعات کو، جو "دربستہ"، "دو خواجہ تاش" اور "تقاضای کاہ" کے عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں اور جن سے اس دور کے امرا و رؤسا کی انتہائی بخیلی کا پتا چلتا ہے، طنز اور کنایہ و اشارہ گوئی کا دلچسپ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی شاعر کسی کنجوس امیر کو براہِ راست خسیس اور بخیل نہیں کہتا بلکہ مختلف اشاروں کنایوں اور بھرپور طنزیہ انداز میں اس کی اس برائی کو آشکار کرتا ہے۔ اس انداز میں مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ تینوں قطعات میں شاعر نے مضامین زیبا اور معانی لطیف پیدا کیے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی دشوار ترکیب یا اجنبی لفظ نہیں ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بڑی سادگی اور روانی سے گفتگو میں مشغول ہے۔

"دربستہ" میں کہتا ہے کہ فلاں امیر کے دروازے تک پہنچنا دشوار کام ہے۔ اور اگر کوئی پہنچ بھی جاتا ہے تو اسے دروازے کی اس جانب سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ شاعر خود کو کتنا ہی چھوٹا اور مختصر کیوں نہ کر لے، پھر بھی دروازے کی محکمی اور سخت بندش کے باعث وہ اندر گھس نہیں سکتا۔ وہ اپنی کوچکی یعنی چھوٹے پن کے باوجود اس قابل نہیں ہے کہ دروازے کے کسی سوراخ ہی سے اندر داخل ہو جائے، یا سورج کی روشنی کی طرح پردوں میں سے گزر کر یا قضائے بد کی طرح دروازے میں سے گزر کر اندر چلا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس خواجہ نے ایسا زبردست اہتمام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص بھی اس تک رسائی حاصل کر کے اس سے فیض نہیں پا سکتا:

گفتند دی مرا کہ "بر خواجہ میروی؟" — گفتم "چو راہ یابم آنجا بسر روم
لیکن چو در ببندد و ندہد جواب کس — من ساعتی بباشم و جای دگر روم
در بستہ دارد اوی و من ارچند کوچکم — ہم نیستم چنانکہ ز سوراخ در روم
من ہمچو آفتاب ز پردہ بنگذرم — نہ چون قضای بد ز دربستہ در روم

شاعر اور اس کا گھوڑا اپنے آقا کے دروازے پر دو خواجہ تاش اور صبر کرنے کے معاملے میں

شہرۂ آفاق ہیں۔ چوں کہ فاقوں نے دونوں کا کچومر نکال دیا ہے، مجبور ہو کر شاعر اپنے آقا سے گھوڑے کے لیے جَو مانگتا ہے تاکہ اس بہانے وہ خود بھی منہ میں کچھ ڈال لے، اور اگر آقا کچھ گندم بھی اسے دے دے تو سبحان اللہ! اس کے وارے نیارے ہو جائیں، اس کو وہ مقام حاصل ہو جائے کہ وہ آسمان کی آنکھوں میں بھی خاک جھونک دے:

من بندہ و اسب ہر دو امروز — بر درگہ تو درو خواجہ تاشیم
در گرسنگی بصبر کردن — ماہر دو درین دیار قاشیم
قدری جو اگر دہی باسبم — ما نیز طفیل اسب باشیم
ور گندم پارۂ دہی نیز — در دیدۂ چرخ خاک پاشیم

تیسرے قطعے میں بھی اسی طنزیہ انداز میں تھوڑی سی گھاس کا تقاضا کیا ہے[1]

بخیلانِ عصر کی خست معاشرے اور ماحول پر کچھ اس قدر اثر انداز ہوئی ہے کہ لوگوں بالخصوص شاعر کی طبع بھی کنجوسی کی طرف مائل ہو گئی ہے، یعنی وہ شاعر جس کی فکر آسمان سے بھی بلند تر تھی اور جس کا ذہن نئے نئے اور بدیع معانی پیدا کرنے کے سبب "کان معنی" سے مخاطب تھا، آج اس کی طبع نے ان امرا کے بخل کا کچھ ایسا رنگ پکڑا ہے کہ سیکڑوں مرتبہ فکر کرنے پر بھی ایسے ایک مضمون نہیں سوجھتا۔ گویا اس کی طبع آب رواں کی مانند تھی جو اب برف کی طرح جم کر رہ گئی ہے، یا پھر اس کی طبع آفتاب کی طرح تھی جو بخل کے بادل میں چھپ گئی ہے:

اگرچہ شاعر نے اس قطعے میں اپنی طبع کی یخ بستگی کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے اور یہاں اس کا طنز بھی سخت و تند ہے۔ دوسرے فارسی شعرا نے بھی بخیلوں کی ہجو کہی ہے، لیکن ایسی صورت کسی کے یہاں نظر نہیں آتی:

مرا ایزد تعالیٰ خاطری داد — کہ دایم با فلک بودی عتابم
بمعنی دادنِ بکر آنچنان بود — کہ با او کانِ معنی بُد خطابم
بہر وقتی کزد کردم سوالی — نہادہ بود صد معنی جوابم
کنون از بخلِ ممدوحان ممسک — غلط بینم ہمی با او حسابم

---

[1] دیوان کامل جمال، ص ۴۱۶

چنان پذرفت رنگ بخل کزوی | بصد اندیشہ یک معنی نیابم
زِ دم سردی این مشتی بخیلان | چنین یخ بند شد طبع چو آبم
در ابر بخل وبی آبی نہان شد | دریغا خاطرِ چون آفتابم

قطعاتِ "صائم الدہر"، "اسپک"، "تشریف" و "بہر دنیشاپوری" سے بھی ممدوحین کی بخیلی وخست کا پتا چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ قطعات ہجو وطنز اور مزاح اور حسن طلب میں بھی ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں، اور فنی لحاظ سے بھی اوصاف کے حامل۔

ایک مدت سے شاعر کے گھوڑے کو ممدوح نے گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں بھجوایا، جس کے نتیجے میں گھوڑا مجبور ہوگیا ہے کہ وہ شب وروز روزے سے رہے۔ خوش قسمتی سے عید کا دن قریب آپہنچا ہے۔ شاعر کو بہانہ ہاتھ لگا ہے، چنانچہ وہ ممدوح سے اپنے روزہ دار گھوڑے کے لیے گھاس دلانے کی درخواست کرتا ہے۔ اس قطعے کا آخری شعر حاصل قطعہ اور شاعر کے مدعا کا غماز ہے۔ یعنی بباطن اسے اس بات کا خدشہ ہے کہ ممدوح اس کی درخواست کو شرف پذیرائی نہ بخشے گا، لہٰذا اس سے کہتا ہے کہ اگر میری درخواست قابلِ قبول نہ ہو تو کم از کم اتنا فتویٰ صادر فرمادیں کہ عید کے روز بھی روزہ رکھنا جائز ہے،

گھوڑے کے ضعف وناتوانی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے، دن کے وقت وہ زخمی سور کی طرح سویا رہتا ہے۔ رات کو اُٹھ کر کتے کی طرح پاسبانی کرتا ہے ہمیشہ رکوع میں رہتا ہے لیکن کبھی کبھار سجدے میں بھی گر پڑتا ہے :

صائم الدہر اسپکی دارم | کہ بدہ روز روزہ نگشاید
روز چون یوز خستہ می خسپد | شب چو سگ پاس در ہمی پاید
در رکوعست سال و مہ لیکن | گہ گہی در سجود افزاید
پارۂ کاہ آرزو کردست | مدتی رفت و بر نمی آید
روز عیداست و ہر کسی لابد | بطعامی دہانِ بیالاید
گر تفضّل کند خداوندم | پارۂ کاہ و جوش فرماید
ورنہ رخصت دہد کہ اندر شرع | روزۂ عید داشتن شاید

اگلے قطعے میں بھی فاقہ زدہ گھوڑے کو موضوع بناکر طنز ومزاح سے کام لیا ہے۔ شاعر کا گھوڑا صبح سے شام تک گھاس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ لیکن شاعر کے پاس پیسہ نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے گھاس خرید سکے۔

توجس طرح :

دل ہی عاشق کی بڑی سوغات ہے اور بیچارے کی کیا اوقات ہے

شاعر کے پاس بھی سوائے غزل اور رباعی کے کچھ نہیں۔ وہ بیچارہ ہر پھر کر گھوڑے کے کانوں میں اپنی غزلیں اور رباعیاں ہی پھونکتا رہتا ہے، لیکن بدذوق گھوڑے کا اصرار گھاس ہی پر ہے، مجبوراً شاعر ممدوح کی طرف رجوع کرتا اور ایک توبرہ گھاس کے لیے کہتا ہے، مگر چونکہ اُسے اپنے مخدوم کا جواب معلوم ہے اس لیے وہ ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجتا ہے کہ اگر حضور کے بھرے ہوئے اصطبل میں گھاس نہ ہو تو ہمارے پڑوس میں ایک شخص گھاس بیچتا ہے :

دعاگو اسبکی دارد کہ ہر روز زعشق کاہ تا شب می خروشد
غزل میخوانم و در وی نگیرد دو بیتی نیز کمتر می نیوشد
توقع دارد از انعام مخدومم کہ بردی تو بواری کاہ پوشد
وگر کہ نیست در اصطبل معمور در این ہمسایہ شخصی می فروشد

قطعہ "نکبت جہاں" میں شاعر کا لہجہ بڑا تند ہے۔ لیکن باوجود کسی قدر عریانی کے یہ قطعہ مضمون آفرینی کا دلچسپ نمونہ ہے۔

قطعہ "پوستین" میں شاعر نے اپنے ممدوح سے پوستین کا تقاضا کیا ہے اور ساتھ ہی اسے بڑے سخت لہجے میں تہدید کرتے ہوئے بالواسطہ یہ کہا ہے کہ پوستین نہیں بھیجو گے تو تمھاری پوستین یعنی کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ اس کے لیے اس نے کلماتِ تنبیہ "ھین" اور "ھان" استعمال کیے ہیں جن سے شعر میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے :

پوستینی بخواستیم از تو تا زمستان بسر بریم در آن
حرمت ما بر تو بود چنانک حرمت پوستین بہ تابستان
بدہ ای خواجہ پوستینم ہین پیشتر زانکہ پوستینت ہان

جمال الدین کی اپنے بعض ہم عصروں سے خاصی چشمک اور نوک جھونک رہی۔ چنانچہ سب ایک دوسرے کی ہجو میں پیش پیش رہے۔ مجیر الدین بیلقانی اپنے وقت کا ایک مشہور شاعر اور اتابکان آذربائیجان کی جانب سے اصفہان کا حکمران تھا۔ اس نے کسی موقع پر اہل اصفہان کی ہجو و ذم میں اشعار کہے جو ایک قطعہ اور

دو رباعیوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں اس نے اصفہان کی تو تعریف کی لیکن اہلِ اصفہان کو "زاغ طبع" کہا اور پائے طاؤس سے تشبیہ دی، پھر انھیں اندھا، بدعہد، سُست اور ایسی قوم قرار دیا جس کا مہدی دجّال ہو۔ جمال نے بھی جواب میں اسے خوب خوب لتاڑا۔ جس سے مجیر کی آزردگی کا سامان ہوا۔ جب مجیر دوسری مرتبہ قزل ارسلان کی طرف سے اصفہان کا مستقل اور خود مختار حاکم بنا تو جمال ڈر کے مارے کہیں چھپ گیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے اس سے معذرت کر لی۔ مجیر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

صفاہان خرم و خوش مینماید — بستان پُر شہر آرای طاؤس
ولی زین زاغ طبعان کاہل شہرند — خجل شد بال خوش سیمای طاؤس
یقین می دان کہ مجموع صفاہان — چو طاؤس است و اینان پای طاؤس
گفتم ز صفاہان مدد جان خیزد — لعلیست مروّت کہ ازان کان خیزد
کی دانستم کاہل صفاہان کورند — با آنہمہ سُرمہ کز سپاہان خیزد
نہ اہل صفاہان و نہ بدعہدیشان — در کار مہر سستی و بی جہدیشان
عیسی دمی ای مجیر دامن درکش — زین قوم کہ دجّال بود مہدیشان

اگرچہ اصفہان کے شعرا نے مجیر کو سخت جواب دیے لیکن ان کی نسبت جمال کے اشعار بلند تر ہیں۔ ہاں ایک جگہ آخری شعر میں تھوڑی سی غلاظت اچھل گئی ہے۔ اس غلاظت کا ذکر کرنے میں وہ واحد شاعر نہیں ہے بلکہ فارسی کے اکثر شعرا نے اپنے مخالفین کو رگیدتے ہوئے اس کثافت کا تذکرہ کیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ بہرحال جمال کا درج ذیل قطعہ اس غلاظت کے باوصف مضمون بدیع اور خاص طنطنے کا حامل اور اس کی قدرتِ بیان کا اچھا نمونہ ہے۔ کہتا ہے کہ روزِ ازل جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نفسِ ناطقہ کو شعاعِ عقل سے پیدا کیا تو قدرت نے اپنی چھاتیوں سے شعرا کی پرورش کی اور ہر شاعر نے اپنی اپنی فصاحت کے مطابق ان چھاتیوں سے دودھ پیا لیکن مجیر چوں کہ دیر سے پہنچا تھا اور دودھ ختم ہو چکا تھا لہٰذا فطرت نے اس کے منہ میں فضلہ ڈال دیا:

ز اول کہ نفس ناطقہ را ز شعاع عقل — ایزد بلطف خویش و برحمت بیافرید
پستان خویش در دہنِ شاعران نہاد — تا ہر کسی بقدر فصاحت ہمی مکید
وز بہر اینکہ دیر تر آمد مجیر دین — شیرش نماندہ بود پس اندر دہانش رید

ایک اور قطعے میں اس نے مجیر کو اصفہان کی ہجو پر سخت ڈانٹ پلائی اور آذر بائیجان کے مختلف شہروں مثلاً گنجہ، تفلیس، بیلقان اور شروان کو گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ غریب خاقانی کو بھی رگڑ ا دیا ہے۔ خاقانی نے اپنی مثنوی تحفۃ العراقین کا ایک نسخہ تحفے کے طور پر جمال کو بھیجا۔ اس مثنوی میں خاقانی نے اپنے تمام ہم عصر شعرا کو ذم بھرے انداز میں یاد کیا اور اپنے سے کم تر قرار دیا تھا، جیسا کہ کہتا ہے:

در نوبت من ہر آنکہ ہستند　　دندان سخن، بریدہ دستند

کس را سخن بلند ازین دست　　سوگند بمصطفیٰ اگر ہست

جمال الدین نے جو یہ اشعار پڑھے تو جھلا اٹھا، اور جواب میں قصیدۂ ذیل لکھ کر شروان بھجوا دیا:

کیست کہ پیغام من بشہر شروان برد　　یک سخن از من بدان مرد سخندان برد

اس قصیدے میں اس نے خاقانی کو طنز و طعن کا نشانہ بنایا ہے، لیکن عجیب بات یہ کہ قصیدے کے آخر میں اسے بڑے احترام اور ستائش سے یاد کیا ہے۔ یہاں صرف طنزیہ اشعار ہی کا تذکرہ مقصود ہے۔ جمال کہتا ہے کہ خاقانی نے شروان سے اپنی مثنوی کا تحفہ عراق بھیج کر اپنی جہالت و حماقت کا ثبوت دیا ہے کیوں کہ اس کی یہ حرکت تو "الٹے بانس بریلی کو" کے مصداق ہے۔ پھر وہ صنعت تلمیح سے کام لے کر خاقانی کے دعویٰ فضل و دانش پر تنقید کرتا ہے۔ اس کے مطابق نہ تو عراق میں رجال کی کمی ہے اور نہ فضل و دانش ہی کا دنیا سے جنازہ اٹھ گیا ہے جو خاقانی ایسا شخص فضل و شجاعت کا ادعا کرے۔ وہ خاقانی کے بھیجے ہوئے تحفے کو ٹڈی کی اس ٹانگ سے تشبیہ دیتا ہے جو کوئی چیونٹی حضرت سلیمان کے پاس بطور تحفہ لے جائے۔ یا یہ کہ کوئی اناڑی بڑھیا ایک [illegible] گدھے پر سوار ہو کر چوگان جیتنے کی کوشش[5] کرے۔ آخر میں جمال نے خود کو بھی اور خاقانی کو بھی ابلہ اور احمق قرار دے کر دونو کو زنداں کے لائق ٹھہرایا ہے اور یہ آرزو کی ہے کہ کوئی ہم دونو کو لے جا کر زنداں میں بند کر دے۔ جمال کا یہ شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ خاقانی سے متاثر ضرور ہے۔ خاقانی کے جواب میں اور اس کے خلاف اس نے سخت الفاظ استعمال تو کر لیے لیکن غالباً اس کے ضمیر نے اسے [illegible] اس نے خود کو بھی برا بھلا کہہ کر کیا اور یوں اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لی اور ضمیر [illegible] ایا اور دوسری صورت اس کی یہ

---

۵ ایران میں کبھی عید کے موقع پر چوگان بازی کا بڑا رواج تھا۔ نوجوان اور پہلوان قسم کے لوگ اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔

بھی ہو سکتی ہے کہ شاعر نے غالب کی طرح جیسا کہ وہ کہتا ہے :

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

خود کو ملوّث کر کے مخالف کی حماقت و ابلہی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہو۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

تحفہ فرستی ز شعر سوی عراق اینت جہل　　ہیچکس از زیرکی زیرہ بکرمان برد ؟

مرد نماند از عراق، فضل نماند از جہان　　کہ دعوی چون تو ئی سر سوی کیوان برد ؟

شعر فرستادنت بما چنانست راست　　کہ مور پای ملخ نزد سلیمان برد

زشت بود روز عید اینکہ زنی جایگی　　پیرزنی خر سوار گوی ز میدان برد

من ز تو احمق ترم تو ز من ابلہ تری　　کسی بباید کہ مان سر دو بزندان برد

اصفہان جمال الدین کا مؤلد تھا اور اپنے اس زاد بوم سے اُسے بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ جب مجیر بیلقانی نے اصفہان کی ہجو کہی تو جمال نے نہ صرف اس کا جواب دیا بلکہ مجیر کو خوب خوب کوسنے بھی دیے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جب اس کا قاری یہ دیکھتا ہے کہ اس نے خود بھی اصفہان کو اپنی ہجو کا تختۂ مشق بنایا ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے" کی تصویر بن جاتا ہے۔ دراصل معاملہ یوں ہے کہ اس دور میں اس شہر کی بُری اور بدحال وضعِ اجتماعی، ناموافق حالات، وہاں کے لوگوں کی بدفطرتی و بدخوئی اور اسی قسم کے دیگر ناگوار عوامل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی زادگاہ کے خلاف بھی لب کشائی کرے۔ دیوان جمال الدین کے مرتب آقای حسن وحید دستگیردی نے اس کا جواز ان الفاظ میں پیش کیا ہے : "جمال الدین با اینہمہ وطن پرستی و زاد بوم دوستی و ستایش اصفہان گاہ گاہ از اصفہان شکایت کردہ یا بنکوہش و ذم یہودی نژادان این شہر کہ پدران آنان بمصلحت وقت برای منافع شخصی مسلمان شدہ ولی تمام خصایل یہود در آنان ہست، پرداختہ است، چنانکہ در این ابیات ملحوظ می افتد :

چند گوئی مرا کہ مذموم ست　　ہر کہ او ذم زاد بوم کند

آنکہ از اصفہان بود محروم　　میتواند کہ ذم روم کند؟"

(کب تک تم مجھے کہو گے کہ اپنی زاد بوم کی مذمت کرنا بُری بات ہے۔ جو شخص اصفہان سے محروم ہو گیا وہ روم کی مذمت کر سکتا ہے ؟)

ایک اور قطعے میں کہتا ہے :

زاد مرا خاک سپاہان و لیک — خوی ندارد کہ پسر پرورد
گرچہ شرر زاید از آتش ہمی — نیست بر آتش کہ شرر پرورد

(اصفہان کی سرزمین نے مجھے جنا ہے لیکن اس میں اپنا فرزند پالنے کی خو نہیں ہے، اگرچہ شرر آگ سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ آگ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ شرر کی پرورش کرے)

اور اس رباعی میں اصفہان میں فن و ادب کی زبوں حالی و خواری کا ذکر کیا ہے:

زینگونہ کہ شد خوار و فرو مایہ ہنر — از جہل پس افتاد بصد پایہ ہنر
یارب تو بفریاد رس آن مسکین را — کش خانہ صفاہان بود و مایہ ہنر

درج ذیل قطعے میں اس نے اصفہان کے اربابِ حشمت کی خست و بخیلی اور دروغ و نفاق پر بڑے طنزیہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ شروع کے اشعار میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو لیکن آخری شعر اس تعریف کی قلعی کھول دیتا ہے۔ وہ اصفہان کو عراق کا سب سے اچھا شہر کہتا ہے جس میں کسی قسم کے بخیل اور خسیس لوگ نہیں رہتے، جہاں کسی قسم کا دروغ و نفاق دیکھنے میں نہیں آتا اور جس کے اصحابِ دولت و ثروت سبھی اربابِ نام و ننگ اور حاکمانِ مطلق ہیں، اور سب کے سب اس مال و مکنت اور سرداری و سروری کے اہل و مستحق ہیں۔ آخر میں کہتا ہے کہ یہ سب ہیں تو صاحبانِ بخشش و عطا لیکن دیتے صرف گالیاں ہی ہیں:

نیست شہری چو شہر اصفاہان — بحقیقت ز شہرہای عراق
کہ نبینی درو خساست و بخل — کہ نیابی درو دروغ و نفاق
خواجگانی بنام و ننگ درو — ہریکی حاکمی علی الاطلاق
ہمہ را خواجگی باستعداد — ہمہ را سروری باستحقاق
ہم دہندہ ہمہ ولی دشنام — ہم خورندہ ہمہ ولی اطلاق

اسی طرح اس قطعے میں بھی اہل اصفہان کے بخل و نفاق اور بے وفائی کی مذمت کی ہے۔ اس میں اس نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے۔ یعنی اہلِ اصفہان کی کنجوسی کو وہ ریت کی تشنگی سے تشبیہ دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مال سمیٹنے میں تو بہت تیز ہیں لیکن سمیٹے ہوئے مال کو ذرا کبھی ہوا نہیں لگنے دیتے۔ اس کے مطابق ان کے مقابلے میں کتے میں زیادہ وفا ہے:

نفاق و بخل در اہلِ سپاہان چنان چون تشنگی در ریگ دیدم
بزرگ و خُرد شان دیدم و ازیشان وفا در سگ کرم در دیگ دیدم

درج ذیل قطعے میں جمال نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ مقصود تو اصفہان اور اہلِ اصفہان کی ہجو ہے لیکن ساتھ ہی اہل قم کو بھی رگید ڈالا ہے۔ اس قطعے میں بھی اس نے کتے کو اہلِ اصفہان سے افضل قرار دیا ہے۔ وہ انھیں بے مروت اور پست ہمت و فطرت کہتا ہے۔ یہ لوگ اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں، کتے کی طرح لوگوں کی کھال کھینچنے والے اور بچھو کی طرح ڈنک مارنے والے ہیں۔ ان میں اور گدھے میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس کے ذرا کان لمبے اور کُھر گول ہوتے ہیں۔ اپنے کتے پن اور خست میں وہ اہلِ قم سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ شاعر کے بقول اصفہان میں سوائے انسانیت، جود و سخا اور مردمی کے سب کچھ مل جاتا ہے:

سگ بہ از مردم سپاہانست بوفاق و وفا و پویہ و دُم
آنچنان مدخلان دون ہمت ہمہ از عالم مروت گم
ہمہ درندہ پوستین چون سگ ہمہ مردم گزای چون کژدم
زن و فرزند شان و یکجو زر دل و جانشان و یکدرم گندم
این چہ بخلست و این چہ امساکست ہم عفی اللہ سگی مردم قُم
بچہ بتوان شناخت خر ز ایشان بدرازی گوش و گردی سُم
بس دریغ آیدم چنین شہری بگروہی ہمہ چو دُردی خم
مردمی اندرو مجوی از انک ہمہ چیزی در اوست جز مردم

جمال الدین کے کلام میں ظرافت و مزاح کی چاشنی بھی کسی قدر پائی جاتی ہے۔ اس میں اس کا انداز ہلکا پھلکا ہے۔ مثلاً ایک قطعہ "مولانا ترازو ست" میں اس نے مزاحیہ انداز میں کسی خاص مولانا یا قاضی کی رشوت خوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسی نے اس کے سامنے اُن مولانا کے عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ترازو سے تشبیہ دی۔ شاعر نے بھی اس کی تائید کی لیکن اس طرح کہ وہ قاضی ایسا ترازو ہے جس کا پلڑا اُدھر جھکتا ہے جدھر مال زیادہ ہو:

مرا گویند مولانا ترازو ئیست کہ عدلش نہ میل این یکی دارد نہ قصد آن دگر دارد

دربن خشک نیست کو بیچو تراز وئیست زین معنی — کہ میلش سوی آن باشند کہ او زر بیشتر دارد

جمال نے کسی امیر شخص سے شراب بھجوانے کی درخواست کی۔ اس نے اپنی خست یا کسی دوسری بنا پر ہلکی قسم کی اور بے مزہ سی شراب بھجوادی۔ شراب پینے پر جب یہ راز اس پر آشکار ہوا تو اس نے درج ذیل قطعہ لکھ کر اس امیر کو بھجوادیا۔ اس قطعے کا آخری شعر حاصل قطعہ ہے اور اس میں شاعر نے ظریفانہ انداز میں شراب کی بے کیفی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں پہلے تو اپنے اس مخدوم کے الطاف و عنایات اور اپنی کم مائگی اور تقصیر کا ذکر کیا ہے اور بعد میں شکوہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ گلہ بظاہر آپ سے ہے لیکن حقیقت میں اپنے زمانے سے ہے۔ یہ آپ نے کیسی شراب بھجوائی کہ سارے شہر میں اس کا چرچا ہے۔ اگرچہ وہ آپ ایسے مخدوم کے شایانِ شان نہ تھی لیکن ہم ایسے احمقوں کے واقعی لائق تھی۔ بہرحال اگر اسے شراب کہا جاسکتا ہے تو ہمارا کنواں پھر شراب خانہ قرار پائے گا۔

مضمون کی جدت کے علاوہ سادگی و روانیِ کلام نے بھی قطعے کو دلچسپ بنا دیا ہے:

ای کریمی کہ دام منت را — کرم و بخشش تو دانہ ماست
ہمہ وقت چون فرو مانیم .. — کف زر بار تو خزانہ ماست
گر بخدمت ہمی رود تقصیر — عفو و حلمیست کان بہانہ ماست
از تو ما را شکایتیست لطیف — وان نہ از تست از زمانہ ماست
آن چہ می بود کہ فرستادی — کہ ہمہ شہر پر فسانہ ماست
لایق بخشش تو نیست ولی — درخور ریش ابلہانہ ماست
اگر آنرا شراب شاید خواند — چاہِ ما پس شرابخانہ ماست

قطعہ "در شیشۂ می"، کا مخاطب بھی غالباً یہی مخدوم ہے۔ اس قطعے میں بھی شراب کی درخواست کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا ہے کہ پچھلی مرتبہ والی نہ ہو کہ وہ "چاہ آب خانہ" سے تھی۔

ذیل کے قطعات (جن کے عنوانات مرتب دیوان نے قائم کیے ہیں) "قارورۂ بیمار"، "شیشۂ آب" اور "آب بجای می" بھی اسی مضمون کے حامل ہیں۔ یعنی اس نے مختلف اربابِ حشمت سے شراب منگوائی بھی اور ہر کسی نے اسے بے مزہ اور بے کیف شراب ہی بھجوائی۔ اس کے یہ تمام قطعات تازہ و بدیع اور دلچسپ مضامین کے حامل اور خاص اسی کا حصہ ہیں، اس لیے کہ دوسرے شعرا کے کلام میں یہ مضمون شاذ ہی

نظر آتے ہیں۔

"قارورۂ بیمار" کے مطابق اس نے کسی نجیب سے شراب مانگی۔ اس نے اپنے غلام کے ہاتھ ایک چھوٹی سی بوتل میں تھوڑی سی بھجوا دی۔ شاعر کو وہ شراب کی بجائے کچھ اور ہی شے نظر آتی، چنانچہ اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ کم بخت کہیں بیمار ہوگا اور یہ قارورہ اس نے طبیب کے پاس بھجوایا ہوگا:

پارۂ می بخواستم ز نجیب | زان می ناب کز زبیب برند (زبیب: خشک انجیر)
روز دیگر غلامکش آورد | پارۂ می کہ از نجیب برند
شیشۂ خرد بود و آبی زرد | گندہ تر زان کہ از ... برند
گفتی آن زن بمزد بیمارست | کآب چونین بر طبیب برند

"شیشۂ آب" میں بھی آب چاہ خانہ والی بات ہے لیکن اس کے شروع میں شاعر نے اس مخدوم کو کوسنے دیے ہیں، اور بعد میں اس قسم کی شراب وصول کرنے سے معذرت چاہی ہے۔

"آب بجای می" میں شاعر نے پہلے ممدوح کی مدح و ستائش کرتے ہوئے غلو سے کام لیا ہے پھر اسے طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا اور آخر میں اُسے بالواسطہ گالیاں دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ایسا حکم نہیں دیا کہ اس خاکسار کو شراب کی بجائے پانی دیا جائے، اس لیے کہ آپ سے اس کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی اور اگر واقعی آپ ہی نے ایسا حکم دیا ہے تو اس سے یقیناً آپ کی یہ غرض ہوگی کہ ایسی چیز بھیجی جائے جو سب مذاہب میں حلال ہو۔

قطعے کے بیشتر اشعار میں طنز پورے طور پر کارفرما ہے۔ یہ قطعہ بھی سادہ گوئی کی ایک اچھی مثال ہے:

ای بزرگی کہ پایۂ قدرت | اولش غایت کمال بود
آفتاب سعادتت آن نیست | کش پس استوا زوال بود
زین تحیت پس از دعا و ثنا | غرض بندہ یک سؤال بود
بارہا با خواص خود گفتی | دست تحقیق چون جمال بود
پس ز بہر یکی قرابۂ می | کہ مرا بر تو رسم سال بود
تا ندیدم من آن ندانستم | کآب ہرگز چنان زلال بود
ہر کہ زین گونہ می دہد بکسی | راستی جای قاف و دال بود

تو نفرموده ای من این دانم | کز تو این موصلت محال بود
یا غرض این مُدست تا باری | بهمه مذہبی حلال بود

ذیل کے قطعے میں گھوڑے کی ہجو مزاحیہ انداز میں کی گئی ہے۔ ممدوح نے اسے انعام کے طور پر ایک گھوڑا عنایت کیا ہے۔ یہ گھوڑا خاصا بوڑھا اور ضعیف ہے۔ شاعر اسے آدم کی مبارک سواری اور حضرت نوح کے زمانے کی یادگار قرار دیتا ہے جسے کشتی نوح میں سوار کیا گیا تھا۔ پھر شاعر نے اس قدیم گھوڑے سے اپنی گفتگو کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ میاں گھوڑے یہ تو بتایے آپ نے اس دنیا میں پہلا قدم کب رکھا؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں وہ پہلا جانور ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھیجا تھا:

خسروا از اصطبل معمور تو کو معمور باد | وارثِ اعمار اسبان شیخ ابو عامر رسید
مرکب میمون آدم دام توفیقہ کہ ہست | یادگار نوح پیغمبر کہ در کشتی کشید
گفت با اسب قدیم آخر کہ تو باری بگو | تا مبارک مقدمت در دورِ عالم کی چمید
گفت چون بسیار گفتی، ہیچ دانی من کیم | آن نخستین جانور کایزد تعالیٰ آفرید

ان ہجویہ اور مزاحیہ قصائد و قطعات کے علاوہ، جن کا اس مضمون میں ذکر ہوا، جمال الدین کے کلام میں ایسے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جو "شکایت از روزگار"، شکایت از رنج و سفر، نکوہشِ زر و سیم اور در نکوہش روزگار وغیرہ نام کے قصائد اور ترکیب بندوں میں موجود ہیں۔ طولِ کلام کے خوف سے ان سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔

انتخاب حدیث :۔ از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب ان احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

صفحات ۲۰ + ۶۶۴ قیمت -/۴۵ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور